© rasailojaraid.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

ہمارے موجودہ صدرِ مملکت زبان کے استعمال کے معاملے میں تو مطلق العنان ہیں ہی، اس لیے ان کی زبان فیض ترجمان سے گفتنی اور ناگفتنی ہر طرح کی باتیں نکلتی رہتی ہیں۔ مگر مئی کے آخر میں انہوں نے مغربی جرمنی کے ایک اخبار نویس کو جو تفصیلی انٹرویو دیا ہے اس میں ایک بات ایسی کہی ہے جو دینی اور قومی نقطۂ نظر سے سخت قابلِ اعتراض ہے۔ ہم صدر صاحب کے اِس مزاج کو جاننے کے باوجود کہ وہ ترنگ میں آکر بعض اوقات بڑی عجیب و غریب باتیں کر جاتے ہیں، جن کے بارے میں وہ قطعی طور پر سنجیدہ نہیں ہوتے، مضطرب ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنے سیاسی اور معاشی عزائم کے اظہار کے لیے ایک ایسی اصطلاح استعمال کی ہے جو ہمارے نزدیک بڑی معنی خیز ہے۔ اس سے پیشتر وہ اپنے ان عزائم کو سوشلزم کے لفظ سے ظاہر کیا کرتے تھے اور کبھی اسے مشرف باسلام کر کے اسلامی سوشلزم کہہ دیتے تھے۔ لیکن اب کی مرتبہ انہوں نے یہ اصطلاح ترک کر کے مارکسزم کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کے ساتھ قوم کو یہ "مژدہ" بھی سنایا ہے کہ وہ اسلام کے معتقدات اور اس کی روایات کے ساتھ مارکسزم کی پیوندکاری کا ارادہ رکھتے ہیں۔

اُن کے اس عزم کو دیکھتے ہوئے انسان کے ذہن میں بالکل ناگزیر طور پر دو احساسات اُبھرتے ہیں۔ پہلا یہ کہ اُن کی نگاہ میں اسلام معاذ اللہ ایک نامکمل ضابطۂ حیات ہے جو اپنی تکمیل کے لیے مارکسزم کی پیوندکاری کا محتاج ہے، کیونکہ اگر وہ اسے مکمل ضابطۂ حیات سمجھتے تو پھر انہیں اسلام کے دینی معتقدات کے ساتھ کارل مارکس کی سیاسی اور معاشی تعلیمات کو جوڑ کر دینِ حق کو مکمل کرنے کی قطعاً ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ دوسرے احساس کے اُبھرتے ہی صاحبِ صدر کی بصیرت اور اُن کی معاملہ فہمی مشتبہ ہو جاتی ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

وہ دین کے عالم نہ سہی، مغربی یونیورسٹیوں کے تربیت یافتہ تو ضرور ہیں۔ ان یونیورسٹیوں میں ایک طویل مدت گزارنے کے بعد ان کے اندر اتنی بصیرت تو پیدا ہو جانی چاہیے تھی کہ وہ اس سادہ سی حقیقت کو سمجھ سکیں کہ اوّل تو دو الگ نظاموں کے مابین، جو حیاتِ انسانی کے سارے گوشوں پر محیط ہوں، کسی قسم کی پیوندکاری کوئی مفید نتائج برآمد نہیں کر سکتی لیکن خاص طور پر دو ایسے نظامہائے حیات جو اساسی تصورات سے لیکر زندگی کی عملی جزئیات تک کے معاملے میں ایک دوسرے سے نہ صرف مختلف ہوں بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہوں، کے مابین کوئی جوڑ لگا کر کسی مفید نتیجہ کی توقع کرنا سراسر خام خیالی ہے۔

کون نہیں جانتا کہ اسلام ایک ایسا مکمل اور ہمہ گیر ضابطۂ حیات ہے جو پورے کا پورا خدا پرستی کی بنیاد پر استوار کیا گیا ہے۔ اس کے معتقدات، اس کا نظامِ اخلاق، اس کا نظامِ معیشت و معاشرت اور اس کا نظامِ سیاست، الغرض زندگی کے سارے شعبے عقیدۂ خدا پرستی کا عکس پیش کرتے ہیں۔

اسلام کے مقابلے میں مارکسزم ایک ایسا ضابطۂ حیات ہے جو اوّل تا آخر مادیت پرستی کی اساس پر قائم ہے۔ اس میں مادہ ہی کو تخلیق کی علتِ اولیٰ قرار دیکر فکر و عمل کے سارے ڈھانچے تیار کیے گئے ہیں۔ اس نظام کی رُو سے مادہ کے سوا اس کائنات کا کوئی خالق و مالک نہیں۔ اس وجہ سے خدا، حشر و نشر، وحی و الہام سب توہمات کا درجہ رکھتے ہیں۔ انسان کا مادّی ماحول جسے مارکس ذرائع پیداوار کا نام دیتا ہے، انسانی شعور اور اخلاق کی صورت گری کرتا ہے۔ اِن ذرائع کی تبدیلی سے نہ صرف معیشت میں تبدیلی ہوتی ہے بلکہ اخلاق، معاشرت، قانون، سیاست، الغرض انفرادی اور اجتماعی زندگی کا پورا ڈھانچہ اُن کے مطابق بدل جاتا ہے۔ اس نظریے کی بنا پر دنیا کا کوئی اصول، خیر و شر کا کوئی پیمانہ بھی مستقل قدر و قیمت کا حامل نہیں بلکہ معاشی تبدیلیوں کے ساتھ یہ اصول اور پیمانے مسلسل بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح حق و ناحق، خوب و ناخوب کا بھی کوئی قطعی اور حتمی معیار نہیں۔ ذرائع پیداوار انسانوں کے مابین جن معاشی روابط کی تشکیل کر دیں وہی ایک خاص وقت میں حق و انصاف کے معیارات قرار پاتے ہیں۔ اور ان ذرائع میں تغیّر کی وجہ سے جو نئے روابط معرضِ وجود میں آئیں وہی دوسرے وقت حق و صداقت کے پیمانے بن جاتے ہیں۔

مارکس کے نزدیک تو خیر مذہب انسانیت کے لیے افیون ہی ہے۔ لیکن اس کے وہ پیرو جنہوں نے مذہب دشمنی میں کسی قدر اعتدال پسندی کا ثبوت دیا، اُن کے نزدیک بھی اگر کوئی مذہب کسی قدر و

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قیمت کا حامل تھا تو وہ ایک خاص عہد اور ماحول میں تھا جس کے بدل جانے سے اُس کی افادیت یکسر ختم ہو گئی ہے۔ چنانچہ ان کی تحریروں میں اسلام کا ذکر بھی اسی انداز سے آیا ہے کہ حضور سرکارِ دوعالم کے عہد میں عرب سماج کے معاشی ڈھانچے میں جو تغیرات پیدا ہو رہے تھے حضورؐ نے ان کا اچھی طرح ادراک کر کے اُن کے تقاضوں کے مطابق عرب سوسائٹی کے اندر تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اور یہی ان معتدل سوشلسٹوں کے نزدیک حضورؐ کا اصلی کارنامہ ہے۔ اُن کے اِن مذموم خیالات کو دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم قیامت تک کے لیے خداوند تعالیٰ کے منشا کو انسانیت پر واضح کرنے والے نہیں بلکہ اپنے دَور کی عرب سوسائٹی کے "انقلابی قائد" تھے، جنہوں نے معاشی میدان میں چند تبدیلیاں لا کر اُس زمانے کے حالات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔

اسلام کے بارے میں اس قسم کے خیالات پر غور کیجیے اور دیکھیے کیا کوئی شخص انہیں قبول کر کے مسلمان رہ سکتا ہے؟ جو "ازم" اس بات کا دعویدار ہو کہ ہر دَور کا اپنا الگ "قرآن" ہے اور جس کے نزدیک کسی نظریے اور عمل کی صحت کا سارا دارومدار صرف اس بات پر ہے کہ وہ پیداوار کے اندر تغیرات کے ساتھ بدلنے کی صلاحیت رکھتا ہو، وہ ازم کسی ابدی پیغام یا کسی ابدی سچائی اور صداقت کا کس طرح علمبردار بن سکتا ہے؟

ہمیں اس وقت اس امر سے کوئی بحث نہیں کہ جو لوگ اس نظریہ کے حامی ہیں وہ خود اس کے کہاں تک پابند ہیں۔ ہمیں تو یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ایک مسلمان جس کا ایمان یہ ہے کہ اسلام انسانیت کے نام خدا کا پہلا اور آخری پیغام ہے اور جس میں قیامت تک کسی تبدیلی کی گنجائش نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہ آخری پیغمبر ہیں جن کے ذریعہ قادرِ مطلق نے اپنے اس پیغام کے مضمرات قیامت تک حتمی صورت میں واضح کر دیئے، اِس بنا پر حضورؐ کی نبوت اصلاحِ معیشت کی کوئی عارضی اور وقتی تحریک نہیں بلکہ ہمہ گیر ہدایتِ الٰہی کا واحد سرچشمہ ہے، وہ اشتراکی خرافات پر کس طرح ایمان لا سکتا ہے؟ جو لوگ اس قسم کے باہم متصادم معتقدات کو ایک دوسرے کے ساتھ پیوست کر کے ایک مخلوطہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں وہ یا تو اناڑی ہیں یا پھر مرفوع القلم۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسلام کے خلاف ماضی میں بھی اعتراضات ہوتے رہے ہیں مگر اُن کی نوعیت زیادہ تر کلامی مسائل کی سی تھی۔ لیکن دَورِ حاضر میں جس قدر اعتراضات ہو رہے ہیں اور اسلامی تعلیمات کے بارے میں ذہنوں میں جو شکوک و شبہات پیدا کیے جا رہے ہیں وہ بیشتر تاریخ کی مادّی تعبیر کی پیداوار ہیں۔ ان اعتراضات کی ساری عمارت اس غلط مفروضے پر اٹھائی گئی ہے کہ معاشی ماحول کے بدل جانے سے حق و صداقت کے معیارات بدل جاتے ہیں۔ چنانچہ اسلام پر اعتراضات کا اگر دقّتِ نظر سے جائزہ لیا جائے تو آپ اُن کی تہ میں یہی غلط مفروضہ کارفرما پائیں گے۔ ہم یہاں چند اعتراضات بطورِ مثال نقل کرتے ہیں۔

اسلامی تعلیمات کو وقتی اور عارضی اور دَورِ حاضر کے لیے بیکار ثابت کرنے کی غرض سے یہ کہا جاتا ہے کہ آخر یہ کہاں کی دانشمندی ہے کہ کسی قدیم معاشرے کے اصولوں کو دَورِ جدید کی ترقی یافتہ اور مہذب سوسائٹی پر ٹھونسنے کی کوشش کی جائے؟ اپنے اس اعتراض کے اندر وزن پیدا کرنے کے لیے یہ دلیل پیش کی جاتی ہے کہ وہ لباس جو ایک چھوٹے بچے کے لیے تراشا جاتا ہے وہ ایک جوان آدمی کے جسم پر کس طرح راست آسکتا ہے اور اگر کوئی شخص ایسی کوشش کرے تو اس کے فاتر العقل ہونے پر کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ دوسرے سارے اعتراضات درحقیقت اسی اعتراض کی مختلف فروعات ہیں۔ مثلاً اسلامی نظام ۳۰ سال تک کامیابی کے ساتھ چلا اور پھر انتشار کی نذر ہو گیا۔ اس اعتراض میں جو کچھ باور کرانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ ۳۰ سال کے عرصے میں عرب کے اندر جو معاشی تبدیلیاں آئیں انھوں نے اس نظام کی افادیت کو ختم کر دیا اور معاشی تغیرات کی وجہ سے ایسے نئے تقاضے اُبھرے جو کسی نئے دین کے طالب تھے۔ اس کے علاوہ اسلام کو یہ بھی طعنہ دیا جاتا ہے کہ یہ بادشاہوں کی پشت پناہی کرتا ہے اور جاگیرداری اور سرمایہ داری کے لیے ڈھال کا کام دیتا ہے۔

اس طعنہ زنی کا مقصد یہ ہے کہ نوجوان نسل کے ذہن میں یہ باطل خیال بٹھا دیا جائے کہ اسلام ایک ایسا رجعت پسندانہ نظام ہے جسے دنیا کے ظالموں نے استحصال اور ناانصافی کے لیے بطورِ آلۂ کار استعمال کیا اور اب تک کرتے چلے آرہے ہیں۔ اس دین کو اللہ تعالیٰ نے انسان کی رہنمائی کے لیے نازل نہیں فرمایا بلکہ جاگیرداروں اور سرمایہ داروں نے استحصال اور اپنے ناجائز مفادات کے تحفظ کے لیے گھڑا ہے اور وہی آج تک اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس طنز میں ایک طرف تو اس دین کے بارے میں بوسیدہ اور از کار رفتہ ہونے کا تاثر قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف یہ باطل

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نقش بھی دل و دماغ پر ثبت ہوتا ہے کہ یہ دین آزادی، روشن خیالی، عدل و انصاف کا دشمن اور ظلم و استبداد کا مؤید اور حامی ہے؟

تاریخ کی مادّی تعبیر جس کی اصل سے اعتراضات کی یہ ساری فروعات پھوٹتی ہیں، انسانیت اور انسانی ارتقاء کے نہایت گمراہ کن مطالعہ پر مبنی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ معاشی حالات میں تغیر و تبدّل سے معاشرتی زندگی بھی بعض اثرات قبول کرتی ہے۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کر لینا کہ ذرائع پیداوار ہی کسی معاشرے کے سیاسی، معاشرتی اور مذہبی تصورات کی صورت گری کرتے ہیں بہت بڑی جہالت ہے۔ اگر مارکس کے اس دعوے کو صحیح مان لیا جاتے تو پھر اُن تمام معاشروں میں فکر و عمل کی پُوری ہم آہنگی پائی جانی چاہیے جن میں ذرائع پیداوار ایک قسم کے ہیں یا جو معاشی اعتبار سے ارتقاء کی ایک خاص سطح پر ہیں۔ لیکن تاریخ کے اوراق نہ صرف یہ کہ اس دعوے کی تصدیق نہیں کرتے بلکہ اس کی پُرزور تردید کرتے ہیں۔ اہلِ روم اور قرنِ اوّل کے مسلمان معیشت کے ایک ہی دور میں تھے مگر ان کے افکار و نظریات، ان کے اخلاقی معیارات، ان کے خوب و ناخوب کے پیمانوں اور اُن کے معاشرتی اور سیاسی ڈھانچوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ اُن کی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں تھا جس میں کسی قسم کی مماثلت پائی جاتی ہو۔ دونوں ہر لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اس تضاد کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ قوموں اور افراد کی تعمیر میں فیصلہ کُن قوت معاشی نہیں بلکہ وہ مقاصد ہیں جن کے حصول کے لیے وہ جد و جہد کرتے ہیں۔ مقاصد کا اختلاف ان کے طرزِ عمل اور طرزِ فکر میں اختلاف پیدا کر دیتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ زندگی کے خارجی مظاہر خصوصاً اس کے معاشی حالات کسی قوم کے فکر و عمل کا ہیولیٰ تیار نہیں کرتے بلکہ اس کے عزائم اور مقاصد اس کی زندگی کی تشکیل کرتے ہیں۔

پھر اسلامی نظام کو لباس پر قیاس کر کے یہ فیصلہ صادر کر دینا کہ چونکہ بچپن کا لباس جوانی میں بیکار ہوتا ہے۔ اس لیے ہر وہ نظامِ حیات جس کا ماضی سے تعلق ہے وہ حال کے لیے بے سُود ہے بلکہ ضرر رساں ہے، قیاس مع الفارق ہے۔ اسلامی نظامِ حیات اور لباس میں کوئی چیز بھی مشترک نہیں، بلکہ اسے اگر انسانی زندگی کے کسی حصّے سے تشبیہ دی جا سکتی ہے تو روح ہے جس طرح روح انسان

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کے ساتھ برابر جاری و ساری رہتی ہے اور وہ کسی مرحلے پر بھی فرسودہ اور بیکار نہیں ہوتی۔ اسی طرح اللہ کا دین بھی ہر عہد اور ہر دور میں انسان کی پوری طرح رہنمائی کرتا ہے۔ وہ کبھی بوسیدہ نہیں ہونے پاتا۔ اس بات کی ضرورت البتہ ہر منزل پر رہتی ہے کہ رُوح کی طرح اللہ کے دین کو بھی ہر قسم کی آلودگی سے پاک رکھا جائے، تاکہ وہ پوری قوت کے ساتھ انسانی جسم کی توانائیوں کو کسی اچھے کام میں لگا سکے۔

اسی نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو حقیقتاً تاریخی تسلسل اللہ کے دین میں پایا جاتا ہے کسی دوسرے نظریۂ حیات میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ جو لوگ مذہب یا کسی نظامِ حیات کو لباس پر قیاس کر کے انسانی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں ان کے نزدیک ماضی کی ہر چیز واقعی عبث اور بیکار ہے۔ لیکن جو لوگ ہدایتِ الٰہی کو انسانیت کے لیے بمنزلہ رُوح سمجھ کر اس کے ارتقاء کا جائزہ لیتے ہیں، وہ پوری تاریخ کو حق و باطل کی ایک نہ ختم ہونے والی کشمکش پاتے ہیں جس میں انسان ماضی سے سبق اور عبرت حاصل کرتا ہے۔ کیونکہ ماضی ہی میں اللہ تعالیٰ نے اُن بزرگ و برتر ہستیوں کو دنیا میں مبعوث فرمایا جنہوں نے اس کشمکش میں مثالی کردار ادا کر کے انسانیت کو یہ بتایا کہ حق کی کس طرح حمایت کرنی چاہیے اور باطل کے خلاف کس عزم، ہمت اور تدبّر سے صف آرا ہونا چاہیے۔

تاریخ کی مادّی تعبیر پر ایمان رکھنے والوں کے لیے تو ممکن ہے کہ انہیں ماضی میں سوائے جہالت اور استحصال کے اور کچھ نظر نہ آتا ہو لیکن وہ قوم ماضی کو کس طرح نظر انداز کر سکتی ہے جسے ان گزرے ہوئے اَدوار میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات میں انسانیت کا سب سے ارفع اور اعلیٰ نمونہ ملا ہو اور جس کی پیروی کر کے ہی اس نے زندگی کے ہر گوشے میں غیر معمولی طور پر نمایاں کامیابیاں حاصل کی ہوں۔ اس قوم سے یہ مطالبہ کرنا کہ وہ ماضی کی طرف دیکھنا چھوڑ دے بہت بڑی حماقت ہے۔ تاریخ درحقیقت انسانی حافظے کا دوسرا نام ہے۔ اُس شخص کے لیے تو بلاشبہ یادِ ماضی عذاب ہے جو اپنے حافظے میں سوائے گھناؤنے جرائم کے اور کوئی چیز محفوظ نہیں پاتا لیکن وہ شخص اپنے ماضی کو کس طرح بھلا دینے پر آمادہ ہو سکتا ہے جس کے حافظے میں پاکبازی، شرافت، دیانت، عدل و انصاف اور خدمتِ انسانیت کی لاتعداد قندیلیں فروزاں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوں۔ ان قندیلوں کی روشنی سے تو وہی شخص خوف زدہ ہو کر انہیں شعور کی نظروں سے اوجھل رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ جس کی فطرت مسخ ہو جانے کی وجہ سے پاکبازی کے مقابلے میں ہوسناکی سے، شرافت کے مقابلے میں رذالت سے، عدل و انصاف کے مقابلے میں ظلم و استبداد سے اور خدمتِ انسانیت کے مقابلے میں عیاری چالاکی اور زبردست آزاری سے ایک گہرا لگاؤ پیدا ہو چکا ہو۔ اسلام نے مسلمانوں کے شعور میں تاریخی تسلسل کے جو گہرے اثرات مترتب کیے ہیں ان کے نقوش اسلامی تہذیب اور معاشرت کے ہر گوشے میں نہایت واضح طور پر دیکھے جا سکتے ہیں۔ ہم یہاں صرف قانون سازی کے دائرے میں ان اثرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ مسلمانوں کے ہاں آزادی اور اصلاحِ احوال کی بے شمار تحریکات نے مختلف ادوار میں جنم لیا، لیکن کبھی بھی ان کے ہاں یہ سوال زیر بحث نہیں آیا کہ آزادی کے بعد یا اصلاحِ احوال کی کسی تحریک کے کامیاب ہو جانے کے بعد وہ کن مقاصد کی تکمیل کریں گے۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ اُن کے مقاصد روزِ اوّل سے متعین ہیں اور مسلم سوسائٹی کے ہر فرد کے قلب و دماغ کی لوح پر یہ مقاصد اسی وقت ثبت ہو جاتے ہیں جب وہ دنیا میں آنکھ کھولتے ہی اذان کی آواز سنتا ہے۔

باقی ممالک کو تو فی الحال جانے دیجیے، صرف اس برِ عظیم کی تاریخ پر نگاہ ڈال کر دیکھیے کہ مسلمانوں میں اصلاحِ احوال کے لیے کتنی تحریکیں اُبھریں۔ ان تحریکوں کے طریقہائے کار میں بھی نمایاں اختلافات رہے۔ لیکن ان کے مقاصد میں کبھی اختلاف پیدا نہیں ہوا۔ ان سب کے پیشِ نظر ایک ہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کی زندگی ہر لحاظ سے اُس نقشے کے مطابق مرتب ہونی چاہیے جو اسلام نے پیش کیا ہے۔ خود تحریکِ پاکستان اسی ایک مقصد کی تکمیل کے لیے شروع ہوئی اور پروان چڑھی۔ اور قیامِ پاکستان کے بعد پوری قوم نے قراردادِ مقاصد کی صورت میں اس حقیقت کو آئینی طور پر تسلیم کیا کہ مسلمانوں کے الگ خطۂ ارضی کے مطالبہ کا مقصد صرف ایک ہی تھا کہ وہ اس ملک میں اسلامی نظام کو برگ و بار لاتے ہوئے دیکھنا چاہتے تھے۔ پچھلے دنوں عدالتِ عظمیٰ نے جو معرکۃ الآرا فیصلہ صادر کیا ہے اس میں بھی فاضل ججوں نے اس بات کی واضح نشاندہی کی ہے کہ قراردادِ مقاصد اس ملک کی اصل سمت ہے جس طرف اُسے بڑھنا چاہیے۔ اس بنا پر آج جو کوئی بھی اسلامی نظام کے نصب العین سے انحراف کرتا ہے۔ وہ درحقیقت اس ملک اور اس قوم کا سب سے بڑا بدخواہ ہے۔

(باقی ص ۲۶ پر)

© rasailojaraid.com